

## اسلوبِ دعوت: مخالفین سے مکالمہ

علامہ یوسف القرضاوی / ترجمہ: ارشاد الرحمن

ترجمان القرآن: دسمبر 2013ء

قرآن مجید کی ایک سخی سورت میں دین کے اسلوبِ خطاب، یعنی دعوتِ دین کا طریق کار متعین کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اُدْعُ اِلٰی سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ ط (النحل 125: 16) ”اے نبی! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے سے جو بہترین ہو۔“ یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد ہر اُس امتی کو مخاطب کرتی ہے جو اس کے دائرے میں آتا ہو۔ اس لیے کہ اللہ کی طرف بلانا، یا اللہ کے راستے کی طرف بلانا، یعنی دعوتِ دین کا کام اور ذمہ داری نبی کریم کے ساتھ ہی مخصوص نہیں تھی بلکہ آپ کی امت سے بھی یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ آپ کی موجودگی میں بھی اور آپ کے بعد بھی آپ کی اس دعوت کو آگے منتقل کرنے کی ذمہ داری ادا کرے۔ ایک دوسری آیت میں قرآن مجید اس بارے میں رسول کریم کی زبانی کہتا ہے: قُلْ هَذِهِ سَبِيْلِي اَدْعُو اِلٰى الدِّقَافِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنْ اتَّبَعَنِي ط (یوسف 108: 12) ”تم ان سے صاف کہہ دو کہ ”میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی۔“ لہذا ہر وہ شخص جو محمد رسول اللہ کا اتباع کرے، اللہ کے رب ہونے پر راضی ہو، اسلام کے دین ہونے پر راضی ہو، محمد کے نبی اور رسول ہونے کو دل و جان سے تسلیم کرتا ہو، وہ اللہ کی طرف دعوت دینے والا (داعی) ہوتا ہے۔ وہ یہ دعوت اپنی قلبی بصیرت اور شرح صدر کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

دعوتِ الی اللہ کے قرآنی اسلوب کا ایک اہم نکتہ ”بہترین انداز میں مکالمہ“ ہے۔ قرآن مجید کے بیان کردہ طریقِ دعوت میں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ آیت مذکورہ میں وعظ و نصیحت (موعظہ) کے بہتر (حسنہ) ہونے پر اکتفا کیا گیا مگر مکالمے (جدال) میں ’حسنہ‘ پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ’احسن‘ (بہترین) طریقے کو اختیار کرنے کی تعلیم دی گئی۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ نصیحت (موعظہ) کا معاملہ اپنے حامیان اور متفقین کے ساتھ ہوتا ہے جب کہ مکالمے (جدال) کا معاملہ مخالفین کے ساتھ ہوتا ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ مکالمہ احسن

انداز میں ہو۔ دوسرے الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ اگر مکالمے کے دو طریقے ہوں: ۱۔ طریقہ حسنہ ۲۔ طریقہ احسن، تو دعوتِ دین کے کارکن کو حکم ہے کہ وہ اپنے مخالفین سے احسن طریقے سے مکالمہ اور گفتگو کرے۔

مکالمے کے احسن طریقے میں بہت سے پہلو شامل ہیں، مثلاً: داعی کو چاہیے کہ وہ اپنے مخالف مخالفین دعوت سے گفتگو کرتے ہوئے انتہائی نرم الفاظ اور انتہائی آسان اسلوب اختیار کرے۔ مقصد یہ کہ اس طرح وہ انہیں اپنے ساتھ مانوس کر لے اور اپنے قریب لے آئے۔ وہ کوئی ایسا لہجہ اور الفاظ استعمال نہ کرے جس سے اُن کے سینوں میں عصبيت اور کینہ پیدا ہو جائے۔ قرآن مجید نے اس ضمن میں بڑی نمایاں اور حیران کن مثالیں ہمارے سامنے رکھی ہیں۔ مشرکین سے مکالمے اور مجادلے کی مثال ملاحظہ کیجیے۔ فرمایا:

قُلْ لَّا تُشَاءُونَ عَمَلًا جَزَمْنَا وَلَا نَشَاءُ عَمَلَهُ ۝ قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط قُلِ السَّلٰوٰۃُ اَنَا وَاٰۤیٰتِيْ كُمْ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ قُلْ لَّا تُشَاءُونَ عَمَلًا جَزَمْنَا وَلَا نَشَاءُ عَمَلَهُ ۝ (الہٰجرات: ۲۴-۲۵) (اے نبی!) ان سے پوچھو، ”کون تم کو آسمانوں اور زمین سے رزق دیتا ہے؟“ کہو، ”اللہ۔ اب) ۝ تَعْمَلُونَ لِمَا لَا يَحٰلُ لَكُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ ۝“ ان سے کہو، ”جو قصور ہم نے کیا ہو اس کی کوئی باز پرس تم سے نہ ہوگی اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی کوئی جواب طلبی ہم سے نہیں کی جائے گی۔“

اس خیر خواہانہ اسلوب میں اپنے مخالف مخاطب کی غلط فہمی کے ازالے اور نفسیاتی تسکین کی ایسی کوشش کی گئی ہے جس سے کافی حد تک وہ مطمئن اور قریب ہو سکتا ہے۔ کہا جا رہا ہے: ”اب لا محالہ ہم میں اور تم میں سے کوئی ایک ہی ہدایت پر ہے یا کھلی گمراہی میں پڑا ہوا ہے۔“ یہ نہیں کہا گیا کہ ”تم کھلی گمراہی میں ہو۔“ آگے مزید دیکھیے کہ حکیمانہ اسلوب کے استعمال کی حد کر دی گئی ہے۔ فرمایا: ”ان سے کہو، جو قصور ہم نے کیا ہو اس کی کوئی باز پرس تم سے نہ ہوگی اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی جواب طلبی ہم سے نہیں کی جائے گی۔“ یہاں الفاظ کا موازنہ کر کے دیکھیے کہ کہا گیا ہے: وَلَا تُنۡسَلِۢمۡ عَمَلًا تَعْمَلُوۡنَ ”جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی جواب طلبی ہم سے نہیں کی جائے گی۔“ یہ نہیں کہا گیا کہ وَلَا تُنۡسَلِۢمۡ عَمَلًا تَجۡرِمُوۡنَ ”جو قصور تم کر رہے ہو اس کی جواب طلبی ہم سے نہیں کی جائے گی“ یعنی قصور اور جرم کو اپنی طرف منسوب کر لیا گیا لیکن اُن کو مانوس اور قریب کرنے کی خاطر جرم کو اُن کی طرف منسوب نہیں کیا گیا۔

دوسری بات جو 'مکالمے کے بہترین انداز' کے تحت آتی ہے وہ فریقین گفتگو کے نزدیک 'مشترکات' پر زور ہے۔ یہاں اختلاف اور مخالفت کے نکات کو اٹھانے کی طرف توجہ ہی نہیں دی گئی۔ طرفین کے درمیان 'زمین مشترک' کا وجود گفتگو کو سنجیدہ اور با مقصد بنانے میں بہت معاون ہوتا ہے۔ یوں فریقین مکالمہ کے نزدیک متفق امور سے فائدہ اٹھانا ممکن ہو جاتا ہے۔

احسن انداز میں دعوت:

قرآن مجید نے اہل کتاب کے ساتھ مکالمے میں اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے: وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ قَالًا الْعَنْكَبُوتِ ۴۶: ۲۹) (اور اہل کتاب) ۵ الدِّينِ ظَلَمُوا مِنْهُمْ وَقَوْلُوا آمَنَّا بِالَّذِي أُنزِلَ إِلَيْنَا وَإِنَّا لَكَاظِمُونَ لِحُكْمِهِمْ وَآلِهَتَانَا وَاللَّحْمُ وَاحِدٌ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقے سے \_\_\_ سوائے اُن لوگوں کے جو اُن میں سے ظالم ہوں \_\_\_ اور اُن سے کہو کہ ”ہم ایمان لائے ہیں اُس چیز پر بھی جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف بھیجی گئی تھی۔ ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے، اور \_\_\_ ہم اُسی کے فرماں بردار ہیں۔“

یہاں قرآن مجید نے اُن عقائد پر زور دیا ہے جو مسلمانوں کو غیر مسلموں سے قریب کر سکیں۔ یہاں یہ عقیدہ بیان کیا گیا ہے کہ مسلمان ہر اُس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے۔ اسی طرح مسلمان اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہر رسول پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ اسی طرح اللہ کے 'یکتا معبود' ہونے پر بھی سب کا ایمان ہے۔ اشتراکِ ایمان کا یہی وہ نکتہ ہے جہاں تمام مذاہب کے اہل ایمان یک جا ہو جاتے ہیں۔ اور اُن سب کی جدوجہد اور کش مکش کا رخ اُن ملحدین و منکرین خدا کی طرف مڑ جاتا ہے جو صرف مادے ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ جن کا اس بات پر کوئی یقین و ایمان نہیں ہے کہ کائنات کا کوئی خدا ہے، انسان کے اندر کوئی روح ہے، اور اس !! دنیا کے بعد کوئی آخرت بھی ہے

بہترین انداز میں مکالمے، میں یہ بات بھی شامل ہے جسے سید قطب شہید نے اپنی تفسیر فی ظلال القرآن میں ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں: ”ان کے ساتھ اگر مجادلے کا موقع پیش آئے تو وہ بھی احسن طریق سے ہو۔ یہ مناسب نہ ہو گا کہ مخالف پر داعی حملہ آور ہو جائے اور اس کو ذلیل کرے یا اس کی قباحتیں بیان کرے۔ دعوت میں مباحثے کا انداز یہ ہو کہ مخاطب کو یقین ہو جائے کہ دعوت دینے والا

محض غلبے اور کلام میں برتری کا حصول نہیں چاہتا بلکہ داعی محض ایک حقیقت ذہن نشین کرانا چاہتا ہے۔ ہر انسان کے اندر کچھ نہ کچھ عناد کا مادہ ہوتا ہے اور ہر شخص کی عزت نفس ہوتی ہے۔ وہ آخر دم تک اپنی رائے کی مدافعت چاہتا ہے تاکہ وہ ہزیمت اور شکست سے بچے۔ اعتقاد و نظریہ دراصل رائے ہوتی ہے اور لوگ رائے کی قدر و قیمت اس قدر بڑھادیتے ہیں کہ اگر کسی کو رائے بدلنے کا کہا جائے تو سمجھتے ہیں کہ ان کے رعب، ان کے احترام اور ان کی شخصیت میں فرق آجائے گا۔ اگر داعی اچھے انداز میں مباحثہ اور مکالمہ کرے تو اس سے کسی شخص کے ذاتی احساس کو ٹھیس نہ پہنچے گی اور مخاطب یہ سمجھے گا کہ اس کی عزت نفس، اس کی شخصیت اور عزت و کرامت محفوظ ہے اور داعی صرف دعوت پہنچانا چاہتا ہے۔ محض اللہ کے لیے اسے ایک اچھی راہ کی طرف بلا رہا ہے۔ اس کام سے اس کی کوئی ذاتی غرض وابستہ نہیں ہے، نہ وہ اپنی فتح اور مخاطب کی شکست چاہتا ہے۔

داعی کے زیادہ جوش اور جذبے کو ذرا کم کرنے کی خاطر نص قرآنی اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ دراصل اللہ ہی زیادہ علیم ہے، وہی جانتا ہے کہ کون گمراہ ہے اور کون ہدایت پانے والا ہے۔ لہذا بحث و مباحثے کے اندر بہت زیادہ جوش اور جدال کی ضرورت نہیں ہے بلکہ (۱۲۵) شائستہ انداز میں دعوت دے دی جائے اور اس کے بعد اس کے نتائج اللہ پر چھوڑ دیے جائیں۔“ (تفسیر سورہ نحل، آیت

: کفار، کے بجائے ’غیر مسلم‘ کا استعمال

مکالمے اور جدال کا وہ بہترین انداز جس کا مسلمانوں سے مطالبہ کیا گیا ہے اور خاص طور پر گلوبلائزیشن کے دور میں اس کی ضرورت ہے، اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ہم اپنے مخالفین کے کفر کا اعتقاد ضرور رکھیں مگر ان کو ’کفار‘ کے نام سے نہ پکاریں، خصوصاً اپنے اہل کتاب مخالفین کے معاملے میں اس بات کو پیش نظر رکھیں۔ ہمارے پاس اس موقف کی دو وجوہ ہیں:

لفظ ’کفار‘ کے متعدد معانی اور مفاہیم ہیں۔ بعض تو یقینی طور پر ہماری مراد نہیں ہوتے، مثلاً: اللہ، اس کے رسولوں اور جہانِ ا۔ آخرت کا انکار، جیسا کہ اُن مادہ پرستوں کا نظریہ ہے جو محسوسات کے علاوہ کسی چیز پر ایمان ہی نہیں رکھتے، لہذا وہ اللہ، رسول اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔

ہم جب اہل کتاب کے بارے میں بات کریں تو یقیناً اس معنی و مفہوم میں ہم انھیں کافر نہیں کہہ سکتے۔ انھیں 'کفار' کہنے کا ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ حضرت محمدؐ کی رسالت و شریعت کے کافر (منکر) ہیں اور یہ بات تو سچ ہے کیونکہ یہی اعتقاد وہ ہمارے بارے میں بھی رکھتے ہیں کہ ہم ان کے مذہب کو نہیں مانتے، لہذا ان کے نزدیک ہم 'کفار' ہیں اور اس پہلو سے یہ بات بھی درست ہے۔ ہمارے اس موقف کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ہم لوگوں کو کافر کہہ کر مخاطب نہ کریں خواہ ۲۔ وہ کافر ہی ہوں۔ غیر اہل ایمان لوگوں کو قرآن مجید میں درج ذیل الفاظ اور ناموں سے مخاطب کیا گیا ہے: يَا أَيُّهَا النَّاسُ (اے انسانو!)، - (يا بَنِي آدَمَ) (اے بنی آدم)، یا عبادِی (اے میرے بندو!) یا أَهْلَ الْكِتَابِ (اے اہل کتاب

قرآن مجید میں دو مقامات (التحریم ۷: ۶۶، الکافرون ۱: ۱۰۹-۶) کے سوالوگوں کو کہیں کافر کے نام سے مخاطب نہیں کیا گیا۔ سورہ کافرون میں ان بات پر مستشرکین کو مخاطب کیا گیا ہے جو رسول کریمؐ سے اس بات پر سودے بازی کی کوشش کر رہے تھے کہ ایک سال آپ ان کے معبودوں کی عبادت کر لیا کریں اور ایک سال وہ آپ کے معبود کی عبادت کیا کریں گے۔ چونکہ ایسی کوششوں کو دو ٹوک اور حتمی و قطعی اسلوب میں ختم کر ڈالنا مقصود تھا، تاکہ اس طرح کی مزید بیان بازیوں کی گنجائش ہی باقی نہ رہے، لہذا رسول اللہ کو حکم دیا گیا کہ آپ دو ٹوک انداز میں ان کو مخاطب کریں جس میں تکرار اور تاکید بھی نمایاں ہو۔ اس دو ٹوک انداز خطاب کے باوجود سورت کا اختتام جس آیت پر ہوتا ہے وہ دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری اور برداشت کا دروازہ کھلا رکھتی ہے، یعنی: لَكُمْ دِينُكُمْ وَ لِي دِينُ (تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین)۔ اس بنا پر میں طویل عرصے سے اس بات کو ترجیح دے رہا ہوں کہ اپنے مخالف دیگر ادیان کے لوگوں کو 'غیر مسلم' کے نام سے مخاطب کیا جائے۔

ذمی، کے بجائے 'شہری' کا استعمال

اسی طرح کچھ الفاظ ایسے ہیں جو ہمارے غیر مسلم اقلیتی بھائیوں کو قبول نہیں، مثلاً 'ذمی' کا لفظ ہمارے مصری قبطی برادران کو پسند نہیں حالانکہ اس لفظ کا مفہوم مثبت ہے، یعنی یہ مفہوم کہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ، رسول کریمؐ اور مسلم جماعت کی ضمانت حاصل ہے۔ اس مفہوم اور مراد کی مسلمان کے دل میں ایک وقعت اور تاثیر ہے۔ وہ یہ بات کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ وہ اللہ و رسولؐ کی ضمانت کو کسی

بھی حال میں توڑ دے۔ جو شخص بھی ایسے فعل کا ارتکاب کرے گا وہ اللہ اور فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت کا مستحق ہوگا۔ تاہم اگر ہمارے مسلم ممالک کے غیر مسلم شہری اس لفظ سے تکلیف محسوس کرتے ہیں تو اس کی جگہ ’شہریت‘ اور ’شہری‘ کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔ فقہا اس بات سے متفق ہیں کہ اسلامی ریاست کے ذمی ’اہل ریاست‘ ہیں اگرچہ وہ ’اہل ملت‘ نہیں۔ ’اہل ریاست‘ کے اس لفظ کو عصری مفہوم میں ’شہری‘ کے لفظ سے بدلا جاسکتا ہے اور لفظ ’ذمی‘ کو حذف کرنے اور بدلنے سے اسلامی شریعت کے کسی حکم اور مسلمہ امر کی مخالفت نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں ہمارے لیے خلفائے راشدین کے طرز عمل میں نمونہ اور مثال موجود ہے۔ اور خلفائے راشدین وہ ہیں جن کی سنت اور طریقے کو اختیار کرنے اور اسے مضبوطی سے پکڑنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے، خصوصاً شیخین،

!! یعنی حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کا طریقہ

بنی تغلب عہد جاہلیت سے مسیحی چلے آ رہے تھے۔ انھوں نے حضرت عمرؓ سے مطالبہ کیا کہ ہم سے ’جزیہ‘ کے نام پر کچھ وصول نہ کیا جائے، یہی چیز ’صدقے‘ کے نام سے وصول کر لی جائے خواہ دگنی لے لیں۔ حضرت عمرؓ نے اُن سے اتفاق کیا اور ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا، البتہ فرمایا: ”یہ احمق قوم ہے، نام کا انکار کر رہے ہیں اور معنی کو قبول کر لیا ہے، حضرت عمرؓ کا یہ ایک بہت اہم اصول کی طرف اشارہ ہے، یعنی مقاصد اور معانی پر نظر رکھنا ضروری ہے نہ کہ الفاظ اور عبارتوں پر۔ کیونکہ اعتبار ناموں اور عنوانوں کا نہیں ہوتا بلکہ اُن چیزوں اور باتوں کا ہوتا ہے جن کے لیے یہ استعمال کیے جاتے ہیں۔

:تعلقاتِ انسانی کے لیے اخوت کی اساس

گلوبلائزیشن کے عہد میں مطلوبہ تعبیرات میں سے ایک تعبیر تمام انسانوں کے درمیان تعلقات کو ’اخوت‘ کا پیرہن عطا کرنا ہے۔ اس سے مراد عام ’انسانی اخوت‘ ہے جو صرف اس بنیاد پر تشکیل پاتی ہے کہ ساری کی ساری انسانیت ایک خاندان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبودیت اور آدمؑ کی ابنیت میں سب انسان مشترک ہیں۔

اسلام تمام انسانوں کو ایک خاندان کے طور پر دیکھتا ہے، ان کے طبقات، علاقے، زبانیں اور رنگ و نسل جو بھی ہوں۔ یہ خاندان بحیثیت مخلوق رب واحد کی طرف اور بحیثیت نسب ایک باپ کی طرف منسوب ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کا اظہار کرتے ہوئے قرآن مجید نے انسانوں کو بلکہ تمام کے تمام انسانوں کو مخاطب کیا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّمَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَكُمْ وَابْتَنَىٰ مِنْهَا كَثِيرًا جَلًّا كَثِيرًا وَأُولَاكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَالرَّحْمَاطُ النَّسَاءِ: ٢) لوگو، اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اُس کا جوڑا بنایا اور ان (O إِنَّ السَّكَّانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا دونوں سے بہت سے مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے۔ اُس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے، اپنے حق مانگتے ہو، اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔

یہاں استعمال ہونے والا لفظ الارحام جن تمام تر انسانی رشتوں پر مشتمل ہے اُس کو ذرا واضح کرنا مناسب ہوگا۔ خاندان انسانی کی وحدت جیسی اس حقیقت کو رسول اسلام حضرت محمدؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر عظیم اجتماع کے سامنے علی الاعلان یوں بیان فرمایا تھا: ”لوگو! یقیناً تمہارا رب ایک ہے، تمہارا باپ ایک ہے، تم سب آدم کی نسل سے ہو، اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔ لہذا کسی عرب کو غیر عرب اور کسی غیر عرب کو عرب پر کوئی فوقیت اور برتری حاصل نہیں مگر صرف تقویٰ کی بنیاد پر۔ کیونکہ تم میں سے اللہ کے۔“ نزدیک معزز ترین وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

رسول کریمؐ کے یہ الفاظ قرآن مجید کی سورہ حجرات کے اس مضمون کو تاکید مزید کے طور پر بیان کرتے ہیں: يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَابْتَنَىٰ مِنْهَا كَثِيرًا جَلًّا كَثِيرًا وَأُولَاكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَالرَّحْمَاطُ النَّسَاءِ: ٢) ”لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد (O ذَكَرُوا نِسِيَّ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاهُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب۔“ سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔

جب یہ چیز موجود ہے تو تمام انسانوں کا انتساب انسانیت کے باپ حضرت آدمؑ کی طرف ہونے کے اعتبار سے انسانی اخوت لامحالہ موجود ہے۔ اس نسبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآن مجید میں پانچ مقامات پر لوگوں کو ’یابنی آدم‘ کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے۔ اس طرح کی تعبیرات دوسروں کو ہم سے قریب کرتی ہیں۔ ہمارے اور اُن کے درمیان حائل خلیج کو پاٹتی ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جو ہمارے خلاف

گھات میں بیٹھے ہمارے دشمنوں اور ان لوگوں کی سازشوں کو ناکام بنا سکتی ہے جو لوگ ایک ملک اور ریاست کے باشندوں کے درمیان فتنے کی آگ بھڑکاتے ہیں۔ ایسی سازشوں کے ذریعے ہمارے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کا انھیں راستہ مل جاتا ہے۔ وہ ہمارے اُوپر تسلط حاصل کر لیتے ہیں اور ہماری گردنوں میں اپنے احکام کی غلامی کا پھندا ڈال دیتے ہیں۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم ایسے مواقع پر ان کی چالوں کو انھی کے اُوپر پلٹ دیں۔ یہ مواقع اُمت کی تمام قوتوں کو اپنے دشمن کے مقابلے میں متحدہ محاذ کی صورت کھڑا کر دیتے ہیں۔

دین کی تعبیرِ جدید کا غلط انداز

گلوبلائزیشن کا عہد اگر ہم سے ایسے جدید دینی طریق کار کا تقاضا کرے جس میں ہم اسلام کو اس کی حقیقت ہی سے منحرف کر دیتے ہوں یا کلام کو اس کے مدعا سے ہٹا دیں، یعنی اسلام غیر مسلموں کی منشا و مرضی کے مطابق انھیں پیش کریں۔ ایسا اسلام جو اُن کا پسندیدہ ہو، ایسا اسلام جس کے پاس نہ اقدام کی صلاحیت ہو نہ دفاع کی طاقت، اُسے حکم دیا جائے تو وہ بلاچوں و چرا تسلیم کر لے، داعیان اور علمائے دین سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ اسلام کا ایسا عقیدہ پیش کریں جس میں شریعت نہ ہو، ایسی عبادت جس میں معاملات نہ ہوں، ایسا امن جس میں جہاد نہ ہو، ایسی شادی جو بلا طلاق ہو، ایسا حق جس کے پاس قوت نہ ہو، ایسا قرآن جس کے پاس نہ تلوار ہو، نہ اس کی دعوت ہو، اور نہ اس کی ریاست و حکومت ہو۔ ایسے اسلام کو ہم نہیں جانتے اور نہ وہ ہمیں جانتا ہے۔ ایسا اسلام قرآن و سنت کا اسلام نہیں ہے۔ رسول اللہ اور صحابہؓ و تابعینؒ کا اسلام نہیں جن کا عہد خیر القرون (بہترین زمانہ) کہلاتا ہے۔

دین کے اندازِ خطاب کی تبدیلی سے مراد اگر یہ ہو کہ اسلام کو محض بندے اور رب کے درمیان تعلق کے طور پر پیش کیا جائے۔ وہ ریاست و حکومت، خاندان و معاشرہ اور فرد کے لیے نظامِ حیات نہ ہو۔ تو یہ مسلمانوں کے مقابلے میں وضع کیا گیا غیر حقیقی اور

غلط اسلام ہے۔ یہ محمد رسول اللہ کا اسلام نہیں ہے، یہ قرآن اور مسلمانوں کا اسلام نہیں ہے۔ ان کا اسلام تو زندگی اور انسان کے لَاشَرِيكَ لَهُ وَبِذَلِكَ ۞ درمیان تقسیم کا قائل نہیں ہے۔ یہ اسلام تو کہتا ہے: قُلْ اِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

الانعام ۱۶۲: ۶-۱۶۳) ”کہو، میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ (ﷻ) اُمْرُتْ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ

۔“ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سراطعت جھکانے والا میں ہوں

دین کے اندازِ خطاب میں تبدیلی سے مراد اگر ان آیات کو حذف کرنا ہو جو یہود اور ان کی غدا ریوں سے بحث کرتی ہیں، میدانِ جنگ میں نبی اور آپ کے لشکر کو چھوڑ کر بت پرستوں سے جا ملنے کا ذکر کرتی ہیں، ان آیات کو حذف کر دینا یا کم سے کم نظر انداز کر دینا اور ان کو اس طرح منجمد کیے رکھنا کہ ذرائع ابلاغ پر ان کو تلاوت نہ کیا جائے، خطیب، مقرر اور مدرس اپنے خطبات، تقاریر اور دروس میں ان کے بارے میں بات نہ کریں۔ تو اُمت مسلمہ اس بات کو نہیں مان سکتی۔ ان کے رب کی کتاب بدستور تلاوت ہوتی رہے گی، آیات کا تذکرہ ہوتا رہے گا۔ یہ معلم اور رہنما کا کردار ادا کرتی رہے گی کیونکہ یہ نورِ مبین اور صراطِ مستقیم ہے۔ جو شخص بھی اس کا علم حاصل کرے گا وہ آگے نکل جائے گا، جو اس کی بنیاد پر بات کرے گا وہ حق کہے گا، جو اس کے مطابق فیصلے کرے گا، انصاف پر مبنی فیصلے کرے گا، جو اس پر عمل کرے گا اجر پائے گا، اور جو اس کی طرف انسانیت کو دعوت دے گا اُسے راہِ راست نصیب ہوگی۔

اسی طرح ’دینی اندازِ خطاب‘ میں تبدیلی سے مراد اگر مسلمانوں کے ہاں عبادات میں سے رکنِ زکوٰۃ کو حذف کر دینا ہو، معاملات میں سے سود کی حرمت کو ختم کر دینا ہو، فوجداری مقدمات میں حدود و تعزیرات کا خاتمہ کر دینا ہو، بین الاقوامی تعلقات میں جہاد کو خارج کر دینا ہو، سیرت النبیؐ سے غزوات کا تذکرہ نکال دینا ہو، مسلم تاریخ سے خالد بن ولید، طارق بن زیاد، صلاح الدین ایوبی، سیف الدین قطر، عمر مختار اور عزالدین القسام کے کارناموں کا ذکر محو کر دینا ہو تو ایسا ہر گزہر گز نہیں ہو سکتا۔ (ماخذ

www.alqaradawi.net)